



اس باب میں ...

پچھلے باب میں قومی تعمیر کے چیلنج کو، جمہوری سیاست کو قائم کرنے کے چیلنج کے ساتھ بیان کیا گیا تھا۔ اسی طرح سیاسی پارٹیوں کے درمیان انتخابی مقابلے آزادی کے فوراً بعد ہی شروع ہو گئے۔ اس باب میں ہم انتخابی سیاست کی پہلی دہائی پر بحث کریں گے تاکہ ہم درج ذیل باتوں کو سمجھ سکیں:

- آزاد اور منصفانہ الیکشن کے نظام کا قیام؛
- آزادی کے فوراً بعد کے سالوں میں کانگریس پارٹی کا غلبہ؛ اور
- مخالف پارٹیوں کا ظہور اور ان کی پالیسیاں۔

مندرجہ بالا مشہور اسٹیج شوٹر کے کارٹونوں کے مجموعہ

Don't Spare Me, Shanker

کے سرورق پر آیا تھا۔ اصل کارٹون چین کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی کے پس منظر میں بنایا گیا تھا۔ لیکن کارٹون حقیقت میں کانگریس کے غلبہ والے زمانے میں اسی کے دوہرے کردار کو ظاہر کرتا ہے۔



ایک پارٹی کی بالادستی کا زمانہ

جمہوریت کی تعمیر کا چیلنج

اب آپ کو ان مشکل حالات کا اندازہ ہو گیا ہو گا جن میں آزاد ہندوستان کا ظہور ہوا۔ ابتدا میں قومی تعمیر کے سلسلے میں جن سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان کے بارے میں بھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں ایسے ہی مسائل سے الجھے ہوئے رہنماؤں نے تو یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جمہوریت کو اختیار نہیں کر سکتے۔ ان کا کہنا تھا کہ قومی اتحاد ان کی پہلی ترجیح ہے اور جمہوریت کا مطلب اختلافات اور تنازعات کو جگہ دینا ہے۔ اس لیے ایسے بہت سے ممالک جو نو آبادیاتی تسلط سے آزاد ہوئے انھوں نے غیر جمہوری طرز حکومت اختیار کر لیا۔ اس طرز حکومت کی کئی شکلیں تھیں۔ جیسے کہ صرف نام نہاد جمہوریت لیکن حقیقت میں ایک لیڈر کی مضبوط گرفت، ایک پارٹی کی حکومت یا براہ راست فوجی حکومت۔ تمام غیر جمہوری حکومتوں کی ابتدا اس وعدے سے ہوئی کہ وہ جلد ہی جمہوری نظام کو نافذ کریں گی لیکن ایک بار اقتدار میں آنے کے بعد ان کو ہٹانا بہت مشکل تھا۔

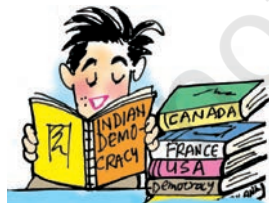
اگرچہ ہندوستان میں بھی حالات کچھ مختلف نہیں تھے لیکن نئے آزاد شدہ ہندوستان کے رہنماؤں نے مشکل راستے کو چننا۔ کیوں کہ ہماری جدوجہد آزادی جمہوریت کے نظریے سے جڑی ہوئی تھی۔ اس لیے کسی اور راستے کا انتخاب حیران کن ہوتا۔ ہمارے لیڈروں کو کسی بھی جمہوریت میں سیاست کے اہم اور نازک کردار کا احساس تھا۔ انھوں نے سیاست کو مسئلہ نہیں بلکہ مسائل کو سلجھانے کا ایک طریقہ سمجھا۔ ہر سماج کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی طرز حکومت کے بارے میں فیصلہ کرے۔ انتخاب کرنے کے لیے متبادل ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ مختلف گروہ مختلف اور متضاد امنگیں اور حوصلے رکھتے ہیں۔ ہم ان اختلافات کو کیسے دور کر سکتے ہیں؟۔ اس سوال کا جواب جمہوری سیاست ہے۔ اگرچہ زور آزمائی اور طاقت بہ ظاہر سیاست کی دو نمایاں خصوصیات ہیں لیکن دراصل مفاد عامہ کا حصول سیاسی سرگرمیوں کا اصل مقصد ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ ہمارے رہنماؤں نے اسی راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا۔

پچھلے سال آپ نے پڑھا تھا کہ ہمارا دستور کس طرح تحریر کیا گیا تھا۔ آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ دستور کی تیاری کے بعد 26 نومبر 1949 کو اسے اختیار کیا گیا 24 جنوری 1950 کو اس پر دستخط کیا گیا اور 26 جنوری 1950 کو اس کا نفاذ عمل میں آیا۔

ہندوستان میں
ہیرو یعنی بڑی اور نمایاں شخصیات
کی پرستش اور ان سے عقیدت
سیاست میں جو کردار ادا کرتی
ہے اس کی نظیر دنیا کے کسی
دوسرے ملک میں نہیں ملتی
لیکن سیاست میں ہیرو کی
پوجا اور عقیدت مندی انحصار
کی جانب ایک یقینی راستہ ہے
جو بالآخر مطلق العنانی یعنی
ڈکٹیٹر شپ پر ختم ہوتا ہے۔

“

بابا صاحب ڈاکٹر بی آر امبیڈکر
قانون ساز اسمبلی میں تقریر
25 نومبر 1949



ہمارے جمہوری ہونے میں کیا خاص
بات ہے؟ آخر کار جلدی یا دیر سے
دنیا کا ہر ملک جمہوری بن گیا ہے۔ کیا
ایسا نہیں ہے؟

عارضی حکومت کی نگرانی میں تھا۔ اس لیے اب یہ لازم تھا کہ ملک میں جمہوری طرز پر منتخب حکومت قائم کی جائے۔ دستور نے اصول وضع کر دیے تھے بس اب مشینری کو حرکت میں لانا تھا۔ شروع میں یہ سمجھا گیا تھا کہ یہ چند مہینوں کا کام ہے۔ جنوری 1950 میں الیکشن کمیشن کا قیام عمل میں آیا اور سوکمار سین ہندوستان کے پہلے چیف الیکشن کمشنر بنے۔ ہندوستان کے پہلے عام انتخابات 1950 کے اندر ہی اندر متوقع تھے۔

لیکن الیکشن کمیشن نے بخوبی سمجھ لیا کہ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں آزاد اور صاف ستھرا الیکشن کرانا آسان کام نہیں ہے۔ الیکشن کا مطلب تھا کہ پہلے انتخابی حلقوں کی حد بندی کی جائے پھر ووٹروں کی فہرست بنے یا ان تمام شہریوں کے ناموں کی فہرست تیار کی جائے جو ووٹ ڈالنے کا حق رکھتے ہوں۔ ان کاموں میں بہت وقت لگا۔ جب پہلا مسودہ تیار ہو کر آیا تو معلوم ہوا کہ فہرست میں تقریباً چالیس لاکھ عورتوں کے نام نہیں لکھے گئے ہیں اور فلاں کی بیوی یا فلاں کی بیٹی لکھا گیا ہے۔ الیکشن کمیشن نے اس فہرست کو نامنظور کر دیا اور نظر ثانی کا حکم دیا بلکہ ضرورت پڑنے پر مسترد کرنے کا بھی۔ پہلے الیکشن کی تیاری ایک عظیم کام تھا۔ دنیا میں اس سے پہلے اس پیمانے پر الیکشن نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تقریباً سترہ کروڑ ووٹر تھے جن کو تین ہزار دو سو قانون ساز اسمبلیوں کے اراکین (MLA) اور چار سو نواسی لوک سبھا کے ممبروں کو منتخب کرنا تھا۔ ان اہل سترہ کروڑ ووٹروں میں صرف پندرہ فی صد پڑھے لکھے تھے۔ لہذا الیکشن کو کسی خاص انداز کی دوئنگ کے طریقہ کار کے متعلق سوچنا تھا۔ الیکشن کمیشن نے تقریباً تین لاکھ اسٹاف کو الیکشن کرانے کی تربیت دی۔



وہ ایک اچھا فیصلہ تھا۔ لیکن آپ ان لوگوں کے متعلق کیا کہیں گے جو اب بھی عورتوں کو مسز فلاں کہہ کر بلاتے ہیں گویا کہ ان کا خود اپنا کوئی نام ہی نہیں ہے؟

بکریہ 20 مئی 1951



اس کارٹون میں کانگریس کی اس الیکشن کمیٹی کے بارے میں ایک تاثر ہے جو 1951 میں پارٹی امیدواروں کو چننے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کارٹون میں نہرو کے ساتھ ساتھ مرارجی ڈیسانئی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے، کامراج ناڈر، راج گوپال آچاریہ، جگ جیون رام، مولانا آزاد، ڈی۔ پی۔ مشرا، پی۔ ڈی۔ ٹنڈن اور گوند بلھ پنت کو دیکھا جاسکتا ہے۔

رائے دہندگی کے بدلتے طریقے

آج کل ہم رائے دہندوں کی ترجیحات کو ریکارڈ کرنے کے لیے الیکٹرونک ووٹنگ مشین (EVM) کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے شروعات اس طرح نہیں کی تھی۔ پہلے عام الیکشن میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر پولنگ بوتھ میں ہر امیدوار کے لیے ایک ایک صندوق رکھا جائے جس پر امیدوار کا چناؤ نشان موجود ہو۔ ہر ووٹر کو ایک خالی بیلٹ پیپر دیا جائے گا جس کو وہ اس امیدوار کے صندوق میں ڈالے گا جس کو وہ ووٹ دینا چاہتا ہے۔ تقریباً بیس لاکھ اسٹیل کے صندوقوں کا استعمال اس مقصد کے لیے ہوا تھا۔ پنجاب کے ایک پریزیڈنٹنگ آفیسر نے ان صندوقوں کی تیاری سے متعلق اپنا



الیکٹرونک ووٹنگ مشین

تجربہ بیان کیا ہے۔ ”ہر صندوق میں امیدوار کا نشان اندر اور باہر چاروں طرف“ اس کے نام کے ساتھ، جوارو، ہندی اور پنجابی میں لکھا ہو، ظاہر ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ چناؤ کے حلقہ، پولنگ اسٹیشن اور پولنگ بوتھ کا نمبر بھی ہونا چاہیے۔ کاغذ کی مہر کو امیدوار کے نمبر شمار کے ساتھ جس پر پریزیڈنٹنگ افسر کے دستخط ہوں، نشان کے فریم میں داخل کرنا ضروری تھا اور اس کی کھڑکی کو اس کے دروازے سے بند کرنا تھا اور جسے اس کے دوسرے سرے پر تار سے باندھنا تھا۔ یہ سب کچھ چناؤ کی پولنگ سے ایک دن پہلے ہونا تھا۔ چناؤ کے نشانوں اور لیبل کو چپکانے کے لیے پہلے صندوق کو ریگ مال یا پتھر کے ٹکڑے سے رگڑنا پڑتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس کام میں چھ لوگوں کو، جن میں میری دو بیٹیاں بھی شامل ہیں، پانچ گھنٹے کا وقت لگا۔ یہ سب کام میرے گھر ہی میں ہوا۔“

No. 05638	199 - Chakral L.A. 2005 - Gudi
1. سونے کی گول	←
2. سونے کی گول	←
3. سونے کی گول	←
4. سونے کی گول	←
5. سونے کی گول	←
6. سونے کی گول	←
7. سونے کی گول	←
8. سونے کی گول	←
9. سونے کی گول	←
10. سونے کی گول	←

تیسری سے لے کر تیرہویں لوک سبھا تک عام الیکشن کے لیے استعمال ہونے والے بیلٹ پیپر کا ایک نمونہ

پہلے دو انتخابات کے بعد یہ طریقہ بدل دیا گیا۔ اب چناؤ کاغذ پر تمام امیدواروں کے نام اور ان کے چناؤ نشان ہوتے تھے۔ رائے دہندگان کو اپنی پسند کے امیدوار کے نام پر مہر لگانی ہوتی تھی۔ اس طریقہ کار پر تقریباً چالیس سال تک عمل ہوتا رہا۔ 1990 کے آخر سے الیکشن کمیشن نے EVM کا استعمال شروع کیا اور 2004 سے کئی ممالک EVM کی طرف منتقل ہو گئے۔

پانچ سو

- اپنے گھر اور پڑوس کے بزرگوں سے ان کے الیکشن میں حصہ لینے کے تجربہ کے بارے میں سوال کریں۔
- کیا ان میں سے کسی نے پہلے اور دوسرے عام الیکشن میں حصہ لیا تھا؟ اس نے کس کو اور کیوں ووٹ دیا تھا؟
- کیا کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے ووٹنگ کے تینوں طریقہ کار کا استعمال کیا ہو؟ ان میں سے اس کو کون سا طریقہ زیادہ پسند آیا تھا؟
- کن اسباب کی بنا پر وہ پہلے کے الیکشن کو آج کے الیکشن سے مختلف پاتے ہیں؟

اس الیکشن کو غیر معمولی بنانے میں صرف رقبہ اور ووٹروں کی تعداد کا ہی ہاتھ نہیں تھا۔ پہلا عام الیکشن ایک غریب اور ان پڑھ ملک میں جمہوریت کی پہلی آزمائش بھی تھا۔ اب تک جمہوریت صرف دولت مند ملکوں ہی میں پنپ سکی تھی خاص طور سے یورپ اور امریکہ میں جہاں تقریباً ہر آدمی پڑھا لکھا تھا۔ اس وقت تک یورپ کے کئی ملکوں میں عورتوں کو حق رائے دہندگی نہیں ملا تھا۔ اس حوالے سے ہندوستان کا عام حق رائے دہندگی کا فیصلہ ایک جرأت مندانہ اور جو کھم بھرا اقدام تھا۔ ایک ہندوستانی ایڈیٹر نے اس کو تاریخ کا سب سے بڑا جوا قرار دیا۔ ایک اور میگزین ’آرگنائزر‘ نے لکھا کہ جواہر لعل نہرو کو ’اپنی زندگی ہی میں عام رائے دہندگی کے حق کی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑے گا‘۔ انڈین سول سروس کے ایک برطانوی ممبر کا خیال تھا کہ ’ایک آنے والا اور زیادہ روشن خیال زمانہ‘ لاکھوں ناخواندہ عوام کے ووٹ کی ریکارڈنگ کے مضحکہ خیز ڈھونگ کو حیرت اور استعجاب کی نظر سے دیکھے گا۔

انتخابات کو دوبارہ ملتوی کرنا پڑا۔ آخر کار اکتوبر 1951 سے فروری 1952 تک الیکشن ہوئے۔ لیکن اس الیکشن کو 1952 الیکشن کے نام سے جانا جاتا ہے کیوں کہ ملک کے اکثر حصے میں ووٹنگ جنوری 1952 میں ہوئی۔ انتخابی مہم ووٹنگ اور ووٹ شمار کرنے میں چھ مہینے صرف ہوئے۔ الیکشن میں مقابلے کا پہلو بھاری تھا اور ایک سیٹ کے لیے اوسطاً چار سے زیادہ امیدواروں میں مقابلہ ہوا۔ حصے داری کا عنصر بھی حوصلہ افزا تھا۔ جب نتیجے سامنے آئے تو شکست خوردہ امیدواروں تک نے اس کو منصفانہ تسلیم کیا۔ ہندوستانی تجربہ نے نکتہ چینوں کو غلط ثابت کر دیا تھا۔ ٹائمز آف انڈیا کے خیال میں انتخابات نے ان تمام شکلیں لوگوں کو حیرانی میں ڈال دیا ہے جن کے خیال میں ہندوستانیوں نے دنیا کی تاریخ میں سب سے بڑے جمہوری انتخاب کے تجربے کی کامیابی میں قابل تعریف بندوبست کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان سے باہر کے مبصرین بھی اسی طرح سے متاثر تھے۔ ہندوستان کا 1952 کا الیکشن ساری دنیا میں جمہوریت کا سنگ میل بن گیا۔ اب اس بحث کی ضرورت نہیں رہی کہ پس ماندگی اور کم تعلیم کے ماحول میں جمہوری الیکشن نہیں ہو سکتے۔ اس الیکشن نے ثابت کر دیا کہ دنیا میں جمہوریت کہیں بھی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



مولانا ابوالکلام آزاد

(1888-1958)

اصل نام۔ ابوالکلام محمد الدین
احمد اسلامیات کے عالم، مجاہد
آزادی اور کانگریس کے رہنما،
ہندو مسلم اتحاد کے حامی،
بٹوارے کے مخالف، دستور ساز
اسمبلی کے رکن اور آزاد ہندوستان
کی پہلی کابینہ میں وزیر تعلیم۔

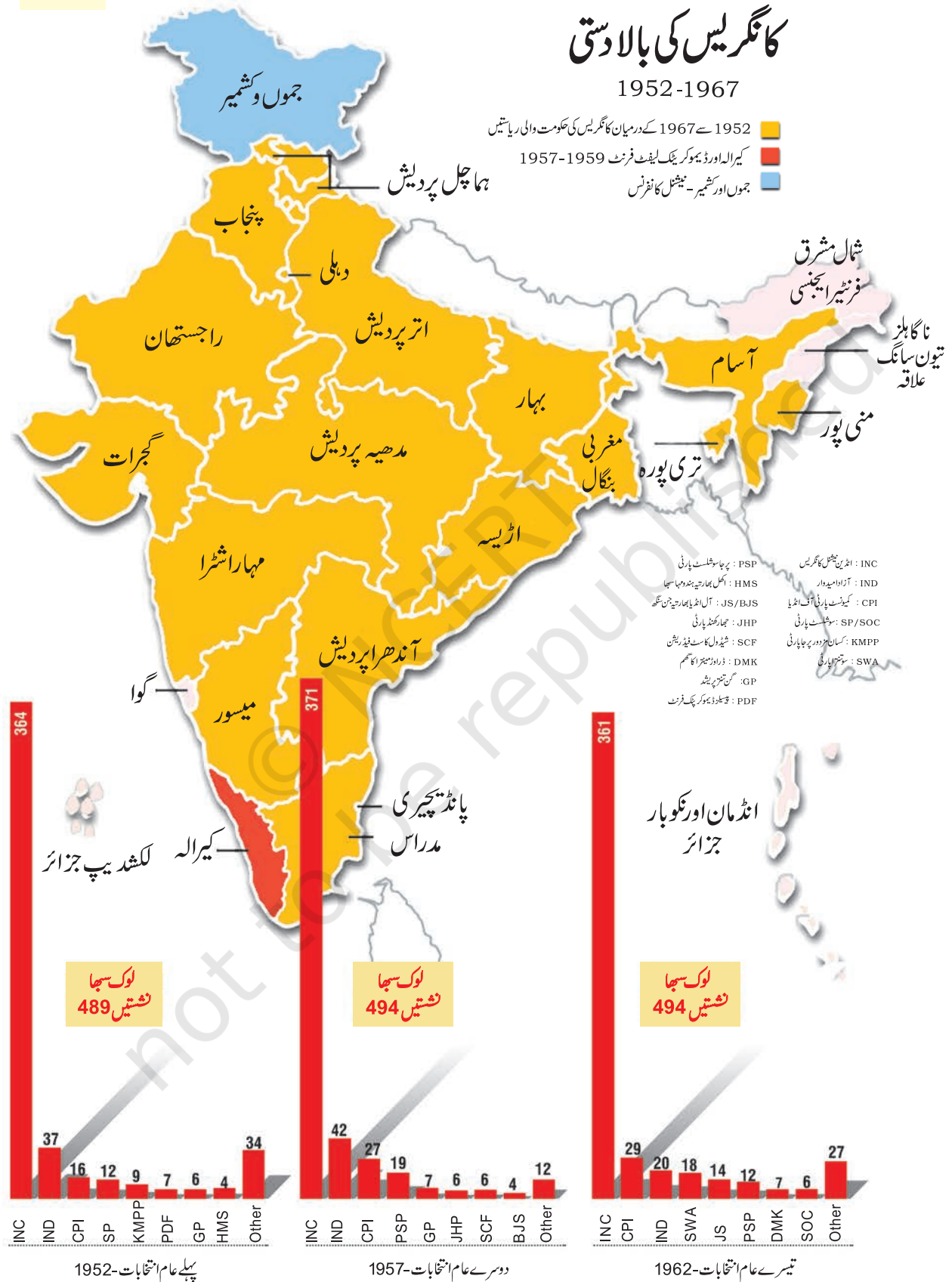
پہلے تین عام انتخابات میں کانگریس کی بالا دستی

پہلے عام الیکشن کے نتائج نے کسی کو حیران نہیں کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی کامیابی متوقع تھی۔ کانگریس پارٹی جو عام طور پر انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے جانی جاتی تھی، جدوجہد آزادی کی وارث تھی۔ اس وقت یہ واحد پارٹی تھی جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ پارٹی میں جواہر لعل نہرو تھے جو اس وقت ہندوستانی سیاست کے مقبول ترین اور پُرکشش رہنما تھے۔ انھوں نے کانگریس کی مہم کی سربراہی کی اور پورے ملک کا دورہ کیا۔ نتائج کے آنے پر کانگریس کی کامیابی کے وسیع پیمانے نے اکثر لوگوں کو حیران کر دیا۔ پہلی لوک سبھا کی 489 سیٹوں میں سے پارٹی

کانگریس کی بالادستی

1952-1967

1952 سے 1967 کے درمیان کانگریس کی حکومت والی ریاستیں
کیا اور ڈیموکریٹک لیفٹ فرنٹ 1957-1959
جموں اور کشمیر - نیشنل کانفرنس



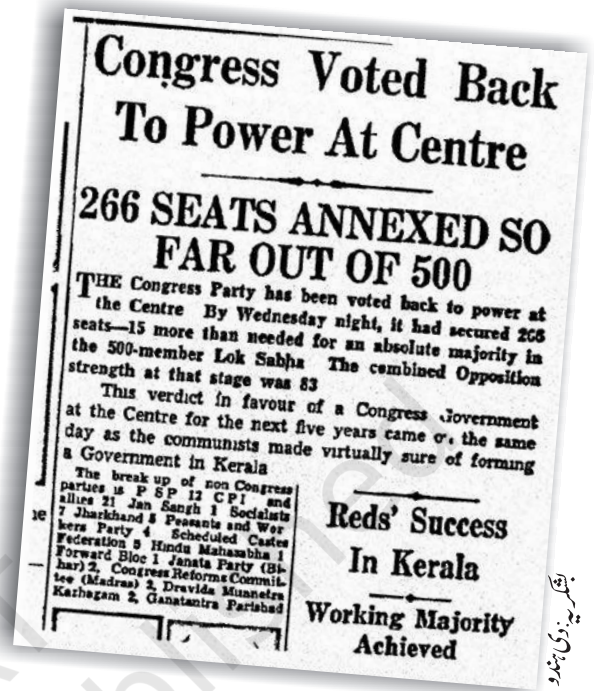
نوٹ: یہ نقشہ پیمائش کے مطابق نہیں بنایا گیا ہے، اسے ہندوستان کی بیرونی سرحدوں کی مستند خاکہ کشی نہ سمجھا جائے۔

نے 364 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی اور اپنی مخالف پارٹیوں سے کہیں آگے نکل گئی۔ جیتی ہوئی سیٹوں کے لحاظ سے دوسری بڑی پارٹی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ جس کے حصے میں 16 سیٹیں آئی تھیں۔ ریاستوں کے الیکشن بھی لوک سبھا کے ساتھ ساتھ ہی ہوئے تھے۔ ان میں بھی کانگریس کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے ٹراؤکور۔ کوچین (اب کیرالا کی ریاست میں) مدراس اور اڑیسہ کے سوا ہر جگہ اکثریت حاصل کی۔ بعد میں ان ریاستوں میں بھی کانگریس کی حکومت بن گئی۔ کانگریس پارٹی ملکی اور ریاستی سطح پر حکمران ہو گئی اور جیسا کہ امید تھی پہلے عام الیکشن کے بعد جو اہل نرہ ووزیر اعظم بنے۔

پچھلے صفحہ پر دیئے گئے انتخابی نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے 1952 سے 1962 تک کے عرصے میں کانگریس کی بالا دستی واضح ہو جائے گی۔ دوسرے اور تیسرے عام الیکشن میں، جو بالترتیب 1957 اور 1962 میں ہوئے، کانگریس نے لوک سبھا کی تین چوتھائی نشستیں حاصل کر کے اپنی بالادستی قائم رکھی۔ کوئی بھی مخالف پارٹی کانگریس کی جیتی ہوئی سیٹوں کا دسواں حصہ بھی نہ حاصل کر پائی۔ ریاستی اسمبلیوں میں کچھ جگہوں پر کانگریس اکثریت حاصل نہیں کر پائی جن میں سب سے اہم 1957 میں کیرالا کا معاملہ تھا جہاں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) کی سربراہی میں ایک مخلوط حکومت قائم ہوئی۔ اس کے علاوہ ہر جگہ ملکی اور ریاستی سطح پر کانگریس ہی غالب رہی۔

ہمارے انتخابی نظام نے کانگریس کی کامیابیوں کو مصنوعی طریقے سے بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ حالاں کہ کانگریس نے ہر چار سیٹوں میں سے تین سیٹوں پر کامیابی حاصل کی لیکن وہ ڈالے گئے ووٹوں کا آدھا حصہ بھی نہ لے سکی۔ مثال کے طور پر 1952 میں کانگریس نے 45 فی صد ووٹ حاصل کیے تھے لیکن اس کی سیٹوں کی تعداد 74 فی صد تھی۔ حاصل کردہ ووٹوں کے اعتبار سے پورے ملک میں سوشلسٹ پارٹی دوسرے نمبر پر تھی جس کو 10 فی صد سے زیادہ ووٹ ملے تھے لیکن وہ 3 فی صدیٹ بھی حاصل نہیں کر سکی۔ یہ سب کیسے ہوا؟ اس کو سمجھنے کے لیے آپ کو پچھلے سال کی درسی کتاب میں 'دستور پر عمل' کے زیر عنوان بحث کو دہرانا پڑے گا۔

ہمارے ملک میں رائج انتخابی نظام کے تحت وہ پارٹی جو اور تمام پارٹیوں سے زیادہ ووٹ حاصل کرتی ہے، اپنے ووٹوں کے تناسب سے زیادہ نشستیں حاصل کرتی ہے۔ اسی طریقہ کار نے کانگریس کے حق میں کام کیا۔ اگر ہم تمام غیر کانگریسی امیدواروں کے ووٹوں کو شمار کریں تو ان کا مجموعہ کانگریس کے امیدوار سے زیادہ ہوگا۔ لیکن غیر کانگریسی ووٹ حریف امیدواروں اور پارٹیوں میں بٹ گئے۔ اس طرح کانگریس مخالف پارٹیوں سے آگے نکل گئی اور کامیاب ہوئی۔



راج کمار امیت کور

(1889-1964)

گاندھیائی نظریہ کی حامل

اور مجاہد آزادی، کپورتھلہ کے

شاہی خاندان سے تعلق، ماں کی

جانب سے عیسائی، دستور ساز اسمبلی

کی رکن، آزاد ہندوستان کی

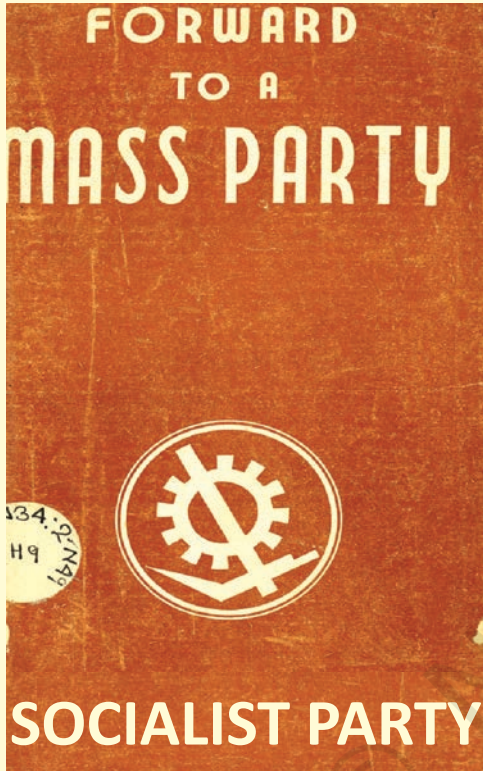
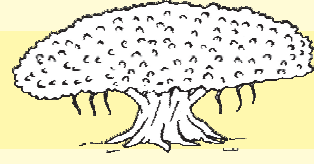
پہلی وزارت میں وزیر صحت؛

1957 تک اس عہدے

پر فائز رہیں۔

2019-20

سوشلسٹ پارٹی



سوشلسٹ پارٹی کی جڑیں آزادی سے پہلے کے ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کی عوامی تحریکوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ 1934 میں کانگریس کے کچھ نوجوان لیڈروں نے جو کانگریس کو ایک زیادہ انقلابی اور سرگرم پارٹی دیکھنا چاہتے تھے کانگریس ہی کے اندر کانگریس سوشلسٹ پارٹی (CSP) کی بنیاد رکھی۔ 1948 میں کانگریس نے اپنے دستور میں ترمیم کی تاکہ اس کے ممبر دوسری پارٹیوں کی دہری ممبر شپ میں نہ ملوث ہوں۔ الیکشن میں پارٹی کی کارکردگی سے اس کے حمایتیوں کو سخت دھچکا لگا۔ حالاں کہ اس کی شانیں ہندوستان کی ہر ریاست میں موجود تھیں لیکن اس کو چند چھوٹے چھوٹے مقامات ہی میں انتخابی کامیابی ملی۔

سوشلسٹ لوگ جمہوری سوشلزم کے نظریے پر یقین رکھتے تھے جو ان کو کانگریس اور کمیونسٹوں، دونوں سے ممتاز کرتا تھا۔ وہ کانگریس پر نکتہ چینی کرتے تھے کہ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں



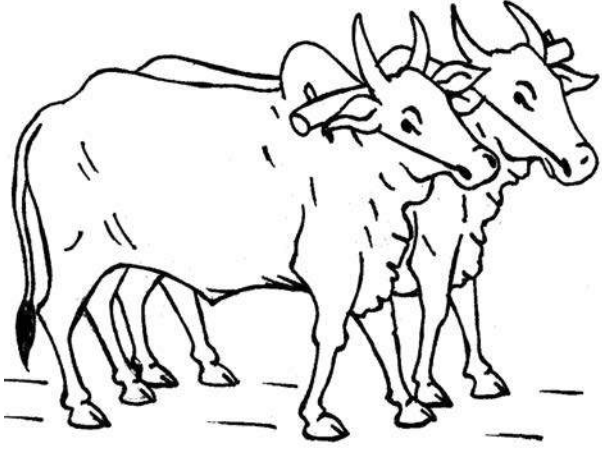
آचारیہ نریندر دیو

(1889-1956)

مجاہد آزادی اور کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے بانی صدر؛ آزادی کی تحریک کے دوران کئی بار جیل گئے؛ کسانوں کی تحریک میں پیش پیش رہے؛ بودھ مذہب کے عالم؛ آزادی کے بعد سوشلسٹ پارٹی کے اور بعد میں پر جاسوشلسٹ پارٹی کے۔

کا ساتھ دیتی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کو نظر انداز کرتی ہے۔ لیکن سوشلسٹ اس وقت تذبذب میں پڑ گئے جب 1955 میں کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ اس کا مقصد ایک سماج وادی معاشرے کی تشکیل ہے۔ سب سوشلسٹوں کے لیے یہ کافی مشکل ہو گیا کہ وہ خود کو کانگریس کے متبادل کی حیثیت سے پیش کر سکیں۔ ان میں سے کچھ، جن کی رہنمائی رام منوہر لویہ کرتے تھے، کانگریس سے اور زیادہ دور ہو گئے اور اس پر تنقید بھی بڑھادی۔ کچھ اور سوشلسٹ جیسے کہ اشوک مہتا کانگریس سے محدود تعاون کے حامی تھے۔

سوشلسٹ پارٹی کئی بار ٹوٹی اور ایک ہوئی۔ نتیجے کے طور پر کئی سوشلسٹ پارٹیاں بن گئیں۔ ان میں کسان مزدور پر جاپارٹی، پر جاسوشلسٹ پارٹی اور متحدہ سوشلسٹ پارٹی اہم ہیں۔ اس پارٹی کے نمایاں لیڈروں میں جے پرکاش نارائن، اچیوٹ پٹور دھن، اشوک مہتا، آچاریہ نریندر دیو، رام منوہر لویہ اور ایس۔ ایم۔ جوشی کے نام لیے جاتے ہیں۔ آج کل کی کئی پارٹیاں جیسے سماج وادی پارٹی، راشٹریہ جنتا دل، جنتا دل (یونائیٹڈ) اور جنتا دل (سیکرلر) اپنی جڑیں سوشلسٹ پارٹی ہی میں بتاتی ہیں۔



کانگریس بالادستی کی نوعیت

ہندوستان اکیلا ملک نہیں ہے جس نے ایک پارٹی کے غلبہ یا بالادستی کا تجربہ کیا ہو۔ اگر ہم دنیا پر نظر ڈالیں تو ہمیں ایک پارٹی کی بالادستی کی کئی مثالیں ملیں گی۔ لیکن ان مثالوں اور ہندوستان کے تجربے میں بہت اہم فرق ہے۔ بقیہ تمام مثالوں میں ایک پارٹی کی بالادستی میں جمہوریت کی قربانی شامل ہے۔ چین، کیوبا اور شام جیسے ممالک میں دستور نے صرف ایک ہی پارٹی کو حکومت کی اجازت دی ہے۔ کچھ دوسرے ممالک جیسے میانمار، بیلاروس، مصر اور اریٹریا فوجی اور قانونی اسباب کی بنیاد پر عملاً

ایک پارٹی ممالک ہیں۔ کچھ سال پہلے تک میکسیکو، جنوبی کوریا اور تائیوان بھی عملی طور سے ایک پارٹی والی ریاستیں تھیں لیکن ان تمام ملکوں اور ہندوستان کے معاملہ میں واضح فرق یہ تھا کہ یہاں کانگریس کی بالادستی جمہوری حالات میں قائم ہوئی۔ یہاں کئی پارٹیوں نے عادلانہ اور منصفانہ الیکشن میں حصہ لیا اور کانگریس الیکشن کے بعد الیکشن میں کامیابی حاصل کرتی چلی گئی۔ یہ صورت حال جنوبی افریقہ میں افریقہ نیشنل کانگریس کی اس بالادستی سے مشابہت رکھتی ہے جو اس نے نسلی علاحدگی پسندگی کے خاتمے کے بعد حاصل کی۔



بابا صاحب بھیم راؤ رام جی امبیڈکر
(1891-1956)

ذات پات مخالف تحریک اور ولتوں کے لیے انصاف کی جدوجہد کے لیڈر؛ انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی کے بانی بعد میں شیڈیول کاسٹ فیڈریشن بنائی؛ ری پبلکن پارٹی آف انڈیا کے منصوبہ کار، دوسری جنگ عظیم میں وائسرائے کی انتظامیہ کا مہینہ کے ممبر، دستور تحریر کرنے والی کمیٹی کے صدر آزادی کے بعد نہرو کی وزارت میں وزیر، ہندو کوڈ بل پر اختلاف کے سبب 1951 میں استعفیٰ دے دیا۔ 1956 میں ہزاروں پیرکاروں کے ساتھ بدھ مذہب اختیار کیا۔



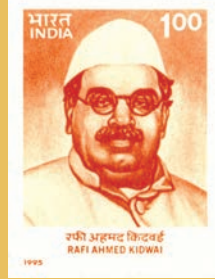
پی۔آر۔آئی 1929 میں قائم ہوئی۔ پورا نام نیشنل ریپبلکن پارٹی تھا اور بعد میں انسٹی ٹیوشنل ریپبلکن پارٹی نام اختیار کیا۔ پی۔آر۔آئی (اپنی زبان میں) میکسیکو میں تقریباً چھ دہائیوں تک برسر اقتدار رہی۔ یہ میکسیکو انقلاب کی وراثت کی نمائندہ تھی۔ شروع میں پی۔آر۔آئی کئی سیاسی پارٹیوں، مزدور تنظیموں فوجی اور سیاسی لیڈروں کے مفادات کا مجموعہ تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد پی۔آر۔آئی کے بانی پلوٹارکو الیس کالاس (Plutarco Elias Calles) نے پارٹی اور اقتدار دونوں پر قبضہ کر لیا۔ الیکشن معمول کے مطابق ہوتے رہے اور ہر بار پی۔آر۔آئی ہی کامیاب ہوئی۔ دوسری پارٹیاں صرف نام ہی کی تھیں تاکہ حکمران پارٹی کو زیادہ قانونی استحقاق حاصل ہو سکے۔ انتخابی قوانین کچھ اس طرح عمل میں لائے جاتے تھے جس سے پی۔آر۔آئی کی جیت یقینی ہو سکے۔ اکثر الیکشن میں حکمران پارٹی دھاندلی کرتی تھی اور جوڑ توڑ سے کام لیتی تھی۔ اس کی حکمرانی کو مکمل آمریت سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ آخر کار 2000 میں ہونے والے صدارتی الیکشن میں پارٹی کو شکست ہوئی۔ اب میکسیکو میں ایک پارٹی کا غلبہ نہیں ہے۔ لیکن ان چالوں سے جو پی۔آر۔آئی کے دوران حکومت استعمال ہوئیں جمہوریت کی نشوونما کافی عرصہ تک بُری طرح متاثر ہوئی۔ عوام کو الیکشن کی عادلانہ اور منصفانہ نوعیت پر اب بھی اعتماد نہیں ہے۔

کانگریس پارٹی کی اس غیر معمول کامیابی کی جڑیں دراصل آزادی کی جدوجہد میں پنہاں تھیں۔ کانگریس کو قومی تحریک کا وارث سمجھا جاتا ہے۔ وہ رہنما جو آزادی کی جنگ میں پیش پیش تھے اب کانگریس کے امیدواروں کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہے تھے۔ کانگریس پہلے ہی سے ایک منظم پارٹی تھی اور جس وقت دوسری سیاسی پارٹیاں اپنی حکمت عملی پر غور کرتیں، کانگریس اپنی مہم یا پرچار شروع کر دیتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر پارٹیاں آزادی کے وقت یا پھر اس کے بعد وجود میں آئیں۔ تو کانگریس کو نشت اول ہونے کا فائدہ حاصل تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آزادی کے وقت ہی کانگریس پارٹی ملک کے طول و عرض میں پھیل چکی تھی اور ساتھ ہی مقامی اور دیہی سطح پر بھی اپنے قدم جما چکی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ابھی تک کانگریس قومی تحریک تھی اس کی نوعیت ہمہ گیر تھی۔ ان تمام عناصر نے کانگریس کی بالادستی میں اہم کردار ادا کیا۔

کانگریس بطور ایک سماجی اور نظریاتی اتحاد

آپ پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح کانگریس 1885 میں تعلیم یافتہ، پیشہ ور اور تجارت پیشہ لوگوں کے ایک پریشر گروپ کی حیثیت سے رفتہ رفتہ بیسویں صدی کی ایک عوامی تحریک میں بدل گئی۔ اسی نے اس کو ایک عوامی سیاسی پارٹی بننے میں مدد دی اور نتیجے کے طور پر سیاسی نظام میں اس کے غلبہ اور بالادستی کے حصول میں بھی۔ اس طرح سے کانگریس کی ابتدا ایک انگریزی بولنے والے، اونچی ذات کے اوسط درجہ کے بالائی سطح والے اور ممتاز شہری افراد کے زیر اثر ہوئی لیکن ہر سول نافرمانی کی تحریک کے ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی اور سماجی بنیاد وسیع ہوتی گئی۔ اس نے مختلف گروہوں کو اکٹھا کیا جن میں سے اکثر کے مفادات متضاد بھی ہوتے تھے۔ کسان اور سرمایہ کار، شہری اور دیہاتی، مزدور اور مالک، نچلے، اوسط اور اونچے درجہ اور ذات والے، سب نے کانگریس میں اپنے لیے جگہ پائی۔ رفتہ رفتہ اس کی باگ ڈور بھی اعلیٰ ذات اور اعلیٰ درجے کے پیشہ وروں سے زرعی اور دیہی پس منظر میں ابھرے ہوئے رہنماؤں کی طرف جانے لگی۔ آزادی کے وقت کانگریس ایک ایسی معاشرتی اور سماجی قوس و قزح کی مانند تھی جو ہندوستان کے مختلف اور متنوع مفادات، زبانوں، مذہبوں، ذاتوں اور طبقوں کی نمائندگی کرتی تھی۔

ان میں سے اکثر نے اپنی شناخت کو کانگریس میں سمودیا اور یوں بھی ہوا کہ بہت سے افراد اور گروہ کانگریس میں شمولیت کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف خیالات رکھتے رہے۔ اس طرح سے کانگریس نظریاتی اشتراک یا اختلاف کا مرکز بھی تھی۔ اس میں انقلابی، امن پسند، قدامت پرست، ترقی پسند، انتہا پسند، اعتدال پسند، دائیں اور بائیں بازو والے سبھی لوگ شامل تھے۔



رفیع احمد قدوائی

(1894-1954)

اتر پردیش کے کانگریس لیڈر؛
1937 اور 1946 میں اتر پردیش
کے وزیر؛ آزاد ہندوستان کی پہلی
کابینہ میں وزیر مواصلات؛
اس کے علاوہ وزیر زراعت
و خوراک 1952-54

پہلے ہم ایک پارٹی کے اندر گٹھ بندھن دیکھتے تھے لیکن اب پارٹیوں کا گٹھ بندھن ہوتا ہے۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ 1952 سے گٹھ بندھن سرکار ہمارے یہاں موجود ہے؟



کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا



1920 کی دہائی کے شروع میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کمیونسٹ گروہوں کا ظہور ہونے لگا تھا جن کو روس کے بالشویک انقلاب سے ترغیب ملی تھی۔ ان کے خیال میں ملک کے مختلف مسائل کا حل سوشلزم یا سماج واد میں پنہاں تھا۔ 1935 سے کمیونسٹ کانگریس پارٹی کے اندر ہی سے کام کرتے تھے لیکن دسمبر 1941 میں الگ ہونے کا وقت آ گیا جب کہ کمیونسٹوں نے نازی جرمنی کے خلاف جنگ میں برطانیہ کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ آزادی کے وقت دوسری غیر کانگریس پارٹیوں کے برعکس کمیونسٹ پارٹی (CPI) کا ڈھانچہ زیادہ متحرک اور اس کا عملہ زیادہ مخلص اور سرگرم عمل تھا۔ لیکن آزادی نے پارٹی کے اندر ہی سوالات کھڑے کر دیئے۔ کیا یہ آزادی مصنوعی ہے یا ہندوستان واقعی آزاد ہے؟



اے۔ کے۔ گوپالن
(1904-1977)

کیرالا کے کمیونسٹ لیڈر، شروع میں کانگریس کارکن کی حیثیت سے کام کیا؛ 1939 میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے؛ 1964 میں کمیونسٹ پارٹی کی تفریق کے بعد سی۔ پی۔ آئی (ایم) میں شامل ہوئے اور پارٹی کو مضبوط بنانے کے لیے کام کیا؛ ایک باوقار پارلیمانی رکن؛ 1952 سے پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔

آزادی کے فوراً بعد پارٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ 1947 میں اقتدار کی منتقلی سچی آزادی نہیں تھی اور تلنگانہ میں پرتشدد ہنگاموں کی

حوصلہ افزائی کی۔ اپنے اس نظریے کے لیے کمیونسٹوں کو عوامی حمایت حاصل نہ ہو سکی اور فوج نے اس تحریک کو کچل دیا۔ اس نے اُن کو اپنے موقف پر نظر ثانی کرنے کے لیے مجبور کیا۔ 1951 میں کمیونسٹ پارٹی نے پُرتشدد انقلاب کا راستہ چھوڑ کر آنے والے الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ پہلے عام الیکشن میں سی پی آئی کو 16 سیٹیں ملیں اور وہ سب سے بڑی حزب مخالف کی صورت میں سامنے آئی۔ پارٹی کو زیادہ تر حمایت آندھرا پردیش، مغربی بنگال، بہار اور کیرالا سے ملی۔

اے۔ کے۔ گوپالن، ایس۔ اے۔ ڈانگے، ای۔ ایم۔ ایس نمودری پد، پی۔ سی۔ جوشی، اے جے گھوش اور پی۔ سندر یا کمیونسٹ پارٹی کے صفِ اوّل کے رہنما تھے۔ سوویت یونین اور چین کے نظریاتی اختلافات کی وجہ سے پارٹی بھی دو حصوں میں بٹ گئی۔ سوویت یونین کی حامی فریق CPI ہی رہی، جب کہ مخالف ممبروں نے CPI (M) کی بنیاد ڈالی۔ یہ دونوں پارٹیاں آج بھی موجود ہیں۔

”سمہاسن“



یہ مرٹھی فلم جو ارون سادھو کے دونوں ’سمہاسن‘ اور ’مہنی دناک‘ پر مبنی مہاراشٹرا کی وزارت اعلیٰ کے لیے رسہ کشی کی منظر کشی کرتی ہے۔ یہ کہانی ایک صحافی ڈیگٹائپس کے ذریعہ بیان کی گئی ہے جو خاموش ’سو تر دھار‘ ہے۔ کہانی کی کوشش حکمران پارٹی کے اندر طاقت کے حصول کی شدید کشش اور حزب مخالف کے ثانوی کردار کو گرفت میں لینا ہے۔

وزیر خزانہ وشواس راؤ دابھدے کی پوری کوشش ہے کہ موجودہ وزیر اعلیٰ کو کرسی سے ہٹا دیا جائے۔ دونوں ہی امیدوار یونین لیڈر ڈی کاشا کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اس کی خوشامد کرتے ہیں۔ دو فریقوں کی اس روایتی جنگ سے دوسرے سیاست داں بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اور دونوں امیدواروں سے سودے بازی کرتے ہیں۔ ممبئی میں اسمگلنگ اور دیگر سنگین سماجی حقائق اس فلم کے ذیلی موضوعات ہیں۔

سال: 1981
ہدایت کار: جبار پٹیل
اسکرین پلے: وجے تندوکر
کردار: نیلو پٹیل، ارون سرناٹک، ڈاکٹر شری رام لاگو، ستیش دوباشی، دتا بھٹ، مدھو کر تو راول، مادھو واٹوے، موہن اگا شے۔

کانگریس مختلف مفادات فرقوں حتیٰ کہ سیاسی پارٹیوں کے لیے بھی ایک ’پلیٹ فارم‘ کی طرح تھی جہاں سے وہ قومی تحریک میں حصہ لے سکتے تھے۔ آزادی سے قبل کے ہندوستان میں بہت سی تنظیموں کو اپنے دستور اور انتظامی ڈھانچے کے ساتھ کانگریس میں رہنے کی اجازت تھی۔ ان میں سے کچھ بعد میں کانگریس سے الگ ہو گئیں اور حزب مخالف بن گئیں جیسے کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی۔ طریقہ کار، پروگرام اور پالیسیوں کے اختلاف کے باوجود پارٹی ایک رائے عامہ ہموار کرنے میں کامیاب رہی اور اگرچہ وہ اختلافات ختم نہ کر پائی لیکن ان کو بڑھنے بھی نہ دیا۔

دھڑوں کی برداشت اور ان کا بندوبست

کانگریس کے ملے جلے طرز نے اس کو غیر معمولی تقویت بخشی۔ اول تو یہ کہ مخلوط تنظیم ہر شامل ہونے والے کو قبول کرتی ہے لہذا وہ کوئی انتہا پسند روش اختیار نہیں کر سکتی اور ہر معاملے میں اس کو اعتدال سے کام لینا پڑتا ہے۔ سمجھوتہ اور تحمل ایک مخلوط تنظیم کی علامت اور ثبوت ہیں۔ اس حکمت عملی نے حزب مخالف کو مشکل میں ڈال دیا۔

حزب مخالف جو کچھ بھی کہنا چاہتی وہ کانگریس کے پروگرام اور نظریات میں جگہ پاسکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس میں ایک ملی جلی طرز کی پارٹی میں اندرونی اختلافات کو برداشت کرنے اور الگ الگ گروہوں یا جتھوں کی امنگوں اور رہنماؤں سے ہم آہنگ ہونے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے درمیان کانگریس نے یہ دونوں چیزیں کیں بلکہ آزادی کے بعد بھی اسی نہج پر چلتی رہی۔ اسی وجہ سے اگر کوئی گروہ یا جتھا پارٹی کے موقف سے خوش نہ ہوتا، یا طاقت میں اپنے حصے کو کافی نہ سمجھتا تو بھی وہ بجائے پارٹی چھوڑ کر اپوزیشن میں جانے کے پارٹی میں رہ کر ہی لڑائی لڑنے کو بہتر سمجھتا تھا۔ پارٹی کے اندر یہ گروہ دھڑے یا جتھے کہلاتے ہیں۔

کانگریس کے مخلوط کردار نے ان جتھوں کو نہ صرف برداشت کیا بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ان میں سے کچھ جتھے تو نظریاتی ٹکراؤ کی وجہ سے بنے تھے لیکن اکثر اوقات ان جتھوں کی بنیاد ذاتی اغراض و مقاصد اور

بھارتیہ جن سنگھ



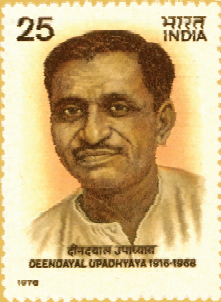
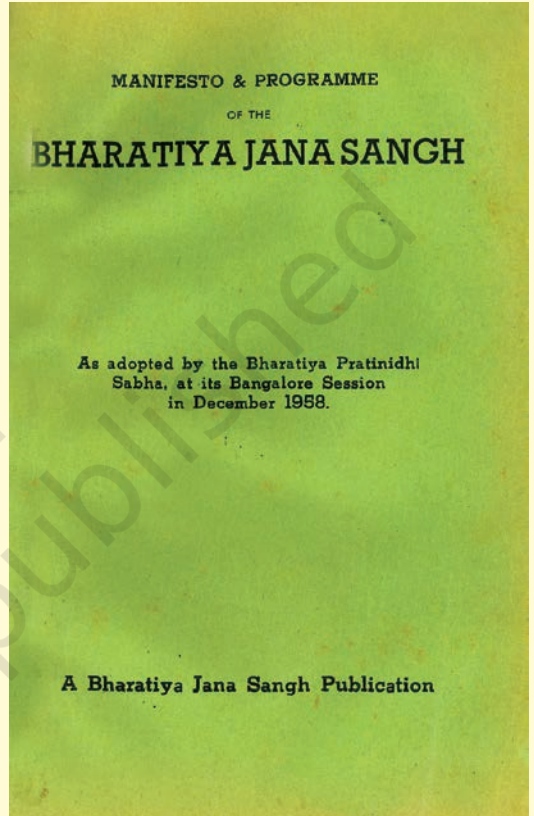
بھارتیہ جن سنگھ 1951 میں قائم ہوئی۔ شیاما پرساد مکھرجی اس کے بانی صدر تھے۔ اس کا سلسلہ بہر حال آزادی سے قبل کی راشنریہ سویم سیوک سنگھ (RSS) اور ہندو مہاسبھا سے ملتا ہے۔

جہاں تک پروگرام اور نظریات کا تعلق ہے جن سنگھ دوسری پارٹیوں سے علاحدہ تھی۔ اس نے ایک ملک، ایک تہذیب اور ایک قوم کے تصور کو فروغ دیا اور یہ یقین رکھا کہ ملک ہندوستانی روایات اور تہذیب کے بل بوتے پر جدید، مضبوط اور ترقی یافتہ ہو سکتا ہے۔ پارٹی نے اکھنڈ بھارت کے اندر

ہندوستان اور پاکستان کو ایک کرنے کی تجویز بھی کی۔ انگریزی کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی حمایت میں ہونے والے مظاہروں میں پارٹی پیش پیش تھی۔ یہ تہذیبی اور مذہبی اقلیتوں کو

مراعات دینے کی بھی مخالف تھی۔ 1964 کے چین کے ایٹمی تجربے کے بعد جن سنگھ مستقل ہندوستان کے نیوکلیائی ہتھیاروں کو فروغ دینے پر زور دیتی رہی۔

پچاس کی دہائی میں جن سنگھ انتخابی سیاست میں حاشیے پر رہی اور لوک سبھا کے 1952 اور 1957 کے الیکشن میں بالترتیب تین اور چار سیٹیں حاصل کر سکی۔ ابتدائی سالوں میں اس کی زیادہ تر حمایت ہندی بولنے والی ریاستوں جیسے راجستھان، مدھیہ پردیش، دہلی اور اتر پردیش کے شہری علاقوں سے آئی۔ پارٹی کے اہم رہنماؤں میں شیاما پرساد مکھرجی، دین دیال اپادھیائے اور بلراج مدھوک کے نام قابل ذکر ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کا جنم بھارتیہ جن سنگھ سے ہی ہوا ہے۔



دین دیال اپادھیائے
(1916-1968)

1942 سے آر ایس ایس کے کل وقتی ممبر؛ بھارتیہ جن سنگھ کے بانیوں میں سے ایک، بھارتیہ جن سنگھ کے سکریٹری اور بعد میں صدر ”متحدہ انسانیت“ کے تصور کی شروعات کی۔

دشمنی یا مسابقت پڑتی ہوتی تھی۔ اس طرح اندرونی گروہ بندی بجائے کمزوری کے کانگریس کے لیے طاقت کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ کیوں کہ کانگریس کے اندر مختلف گروہوں کو آپس میں لڑنے کی آزادی تھی اس لیے وہ لیڈر، جوا لگ الگ مفاد اور نظریات کی نمائندگی کرتے تھے، کانگریس ہی میں رہے اور باہر جا کر نئی پارٹی نہیں بنائی۔

کانگریس کے اکثر ریاستی یونٹ بھی ان ہی جتھوں یا گروہوں کا مجموعہ تھے۔ ان جتھوں کے علاوہ نظریات کی وجہ سے کانگریس ایک عظیم مرکزی پارٹی نظر آنے لگی۔ دوسری پارٹیوں نے ان جتھوں پر اپنا اثر استعمال کرنا شروع کیا اور اس طرح 'کنارے' پر رہ کر بالواسطہ طور سے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ یہ پارٹیاں حقیقی طاقت کے استعمال سے بہت دور کر دی گئی تھیں۔ یہ حکمران پارٹی کا متبادل تو نہیں تھیں لیکن یہ مستقل طور سے کانگریس پر نکتہ چینی اور اس کی ملامت کرتی تھیں اور اس پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتی تھیں۔ جتھوں کے اس نظام نے حکمران پارٹی کے اندر ایک توازن برقرار رکھا اور سیاسی زور آزمائی کانگریس کے اندر ہی محدود رہی۔ یعنی ایک طرح سے انتخابی مقابلوں کے پہلے دس سال میں کانگریس نے حکمران پارٹی اور اپوزیشن دونوں کا کردار نبھایا۔ اسی لیے ہندوستانی سیاست کے اس زمانے کو 'کانگریس سسٹم' کے نام سے بیان کیا جاتا ہے۔



میرا خیال تھا کہ گروہ بندی ایک بیماری ہے جس کا علاج ہونا چاہیے۔ لیکن آپ تو ایسا کہہ رہے ہیں کہ گروہ بندی ایک عام اور اچھی چیز ہے۔

اپوزیشن پارٹیوں کا ظہور

جو کچھ بھی ہم نے اوپر پڑھا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں اپوزیشن پارٹیاں یا حزب مخالف موجود نہیں تھے۔ الیکشن کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے ہم نے کانگریس کے علاوہ اور بھی کئی پارٹیوں کے نام لیے تھے۔ اس وقت بھی ہندوستان میں کئی کثیر الجماعت جمہوری ملکوں سے زیادہ سرگرم اور متنوع پارٹیاں موجود تھیں۔ ان میں سے اکثر 1952 کے پہلے عام الیکشن سے قبل وجود میں آئی تھیں اور ان میں سے کئی نے چھٹی اور ساتویں دہائی کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔ آج کی کم و بیش تمام غیر کانگریس پارٹیوں کی جڑیں 1950 کی کسی اپوزیشن پارٹی میں تلاش کی جاسکتی ہیں۔

اس زمانے میں تمام اپوزیشن پارٹیاں لوک سمجھا اور ریاستی اسمبلیوں میں صرف ایک علامتی نمائندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اس کے باوجود ان کی موجودگی نے نظام کے جمہوری کردار کو برقرار رکھنے میں مدد کی۔ ان پارٹیوں نے کانگریس کی پالیسیوں اور عمل پر حق بجانب اور با اصول تنقید کی جس کی وجہ سے کانگریس پارٹی قابو سے باہر نہ گئی اور اس طرح کانگریس کے اندر طاقت میں توازن اور اعتدال قائم رہا۔



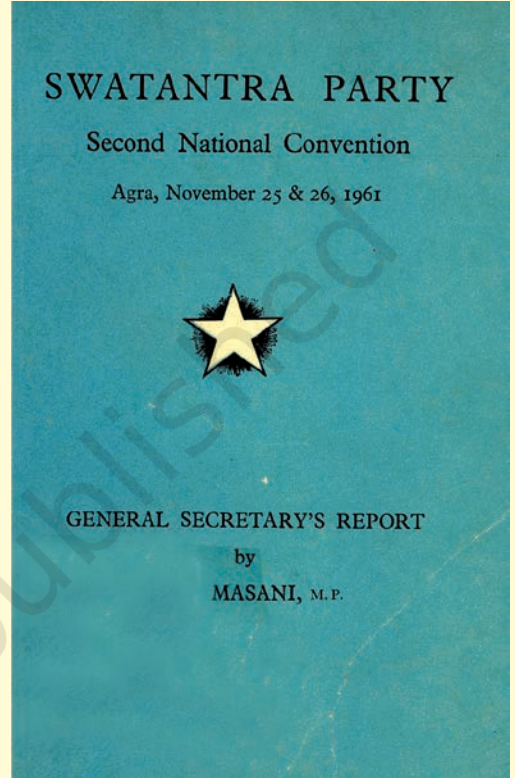
”رسہ کشی کی جنگ“ (29 اگست 1954) ایک کارٹونسٹ کا حکمران اور اپوزیشن پارٹیوں کی طاقت توازن کے بارے میں تاثر ہے۔ درخت پر نہرو اور ان کی کابینہ کے ساتھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپوزیشن لیڈر جو درخت گرانے کی کوشش کر رہے ہیں ان میں اے۔ کے۔ گوپالن، آچاریہ کرپلائی، این۔ سی۔ چٹرجی، سری کانتھن نائر اور سردار حکم سنگھ شامل ہیں۔

سو تنتر پارٹی



اگست 1959 میں سو تنتر پارٹی اس وقت قائم ہوئی جب کانگریس نے ناگپور قرارداد میں زمین کی سیلنگ، حکومت کا اناج کی تجارت کو قبضہ میں لینا اور مشترک زراعت کو اختیار کیا۔ اس پارٹی کے بزرگ کانگریس رہنماؤں میں راج گوپال آچاری، کے۔ ایم۔ منشی، این۔ جی۔ رائگا اور مینو مسانی شامل تھے۔ یہ پارٹی اپنے معاشی موقف کی وجہ سے دوسری پارٹیوں سے ممتاز تھی۔

سو تنتر پارٹی کا خیال تھا کہ حکومت کو اقتصادی معاملات میں کم سے کم دخل دینا چاہیے۔ اس کے نظریے کے مطابق خوش حالی صرف شخصی آزادی کے ذریعے ہی آسکتی ہے۔ یہ اقتصادیات میں حکومت کی دخل اندازی، مرکزی



سی۔ راج گوپال آچاری
(1878-1972)

کانگریس کے بزرگ رہنما اور ادیب؛ مہاتما گاندھی کے قریبی ساتھی؛ دستور ساز اسمبلی کے ممبر؛ ملک کے ہندوستانی پہلے گورنر جنرل (1948-1950) مرکزی کابینہ میں وزیر، بعد میں ریاست مدراس کے وزیر اعلیٰ؛ ہندوستان کے پہلے بھارت رتن حاصل کرنے والے؛ سو تنتر پارٹی کے بانی (1959)

منصوبہ بندی، عوامی شعبہ اور قومیا نے کی پالیسی پر تنقید کرتی تھی اور پرائیویٹ سیکٹر کو وسعت دینے کے حق میں تھی۔ سو تنتر پارٹی زرعی زمین کی سیلنگ، مشترک کاشت کاری اور سرکاری تجارت کی بھی مخالف تھی۔ یہ تدریجی ٹیکس ڈھانچے کی بھی مخالف تھی اور اس نے لائسنس ڈھانچہ (regime) کو توڑنے کا مطالبہ کیا۔ یہ ناوابستگی کی پالیسی اور روس سے خوش گوار تعلقات سے بھی پریشان تھی۔ اس نے یونائیٹڈ اسٹیٹس سے قریبی تعلقات رکھنے کا مطالبہ کیا۔ سو تنتر پارٹی نے ملک کی مختلف علاقائی پارٹیوں اور مفادات کو خود میں ضم کر کے قوت حاصل کی۔ اس پارٹی میں جاگیرداروں اور راجاؤں کے لیے کشش تھی جن کا مقصد اپنی اس زمین اور وقار کا تحفظ تھا جو زمینی اصلاحات کے قانون کے باعث خطرے میں پڑ گئے تھے۔ سرمایہ دار اور تاجر طبقہ، جو قومی ملکیت کاری اور لائسنس کی پالیسی کے خلاف تھا، سو تنتر پارٹی کا حامی بن گیا۔ پارٹی کی سماجی بنیاد کمزور تھی اور مخلص کارکنوں کا فقدان تھا۔ لہذا یہ ایک مضبوط تنظیمی ڈھانچہ بنانے میں ناکام رہی۔

ایک سیاسی اور جمہوری متبادل کی امید کو زندہ رکھنے سے ان پارٹیوں نے درحقیقت نظام کے خلاف ناراضگی جمہوریت مخالف ہونے سے بچالیا۔ ان پارٹیوں نے ان لیڈروں کی تربیت بھی کی جنہیں بعد میں ملک کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنا تھا۔

ابتدائی سالوں میں کانگریس اور حزب مخالف کے رہنماؤں کے درمیان کافی باہمی احترام تھا۔ آزادی کے اعلان کے بعد اور پہلے عام انتخابات سے قبل جس عارضی حکومت نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی اس میں ڈاکٹر امبیڈکر اور شیاما پرساد مکھرجی جیسے اپوزیشن کے لیڈر کا بیٹھنا شامل تھے۔ جواہر لعل نہرو نے اکثر سوشلسٹ پارٹی کی پسندیدگی کا اظہار کیا اور بے پرکاش نارائن جیسے سوشلسٹ لیڈروں کو حکومت میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی۔ ذاتی تعلقات کی یہ نوعیت اور سیاسی حریفوں کا عزت و احترام پارٹیوں کی مقابلہ آرائی کی شدت کے ساتھ ساتھ ختم ہو گیا۔

اس طرح ہماری جمہوری سیاست کا پہلا دور منفرد تھا۔ کانگریس نے جس قومی تحریک کی قیادت کی تھی اس کی ہمہ گیری کے باعث کانگریس میں وہ کشش پیدا ہو گئی جس سے مختلف گروہ، طبقات اور مفادات اس کی جانب کھینچے چلے آئے اور یہ وسیع بنیادوں پر مبنی ایک سماجی اور نظریاتی طور پر مخلوط پارٹی بن گئی۔ آزادی کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کرنے کی وجہ سے کانگریس پارٹی کو دوسروں کے مقابلے میں ایک بہتر شروعات نصیب ہوئی۔

”بعض کانگریسیوں کے نزدیک حکومت یا کانگریس میں میری موجودگی اتنی اہم نہیں جتنی کہ ٹنڈن کا الیکشن..... کانگریس اور حکومت دونوں میں میری افادیت ختم ہو چکی ہے۔“

جواہر لعل نہرو
کانگریس کے عہدے پر اپنی
مرضی کے خلاف ٹنڈن کی
جیت کے بعد راجا جی کو لکھے
گئے ایک خط کے الفاظ



1948 میں گورنر جنرل چکرورتی راج گوپال آچاری کی حلف برداری کے بعد نہرو کی کابینہ (بیٹھے ہوئے بائیں سے دائیں) رفیع احمد قدوائی، بلد یوگلہ، مولانا آزاد، وزیراعظم نہرو، چکرورتی راج گوپال آچاری، سردار ولہ بھائی پٹیل، راج کمار امرت کور، مسٹر جان مٹھائی، اور جگ جیون رام (کھڑے ہوئے بائیں سے دائیں) جناب گاڈگل، جناب نیوگی، ڈاکٹر امبیڈکر، شیاما پرساد مکھرجی، گوپالاسوامی آینگر اور بے رام داس دولت رام۔



فانی شورشور ناتھ ریو

بہار کے ایک گاؤں میں پارٹی کے اندر مقابلہ

جب دو بھینسے آپس میں لڑتے ہیں تو ان کے نیچے کی گھاس مسل جاتی ہے۔ کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہی ہیں۔ دونوں نئے ممبروں کو شامل کرنا چاہتی ہیں۔ غریب آدمی چکی کے دوپاٹوں کے بیچ پس جائے گا!

”نہیں، غریب آدمی نہیں پسے گا۔ بلکہ حقیقت میں اس کو فائدہ ہوگا۔“ کسی نے جواب دیا۔ ”کام صرف ایک ہی پارٹی نہیں مکمل کرتی۔ دو گروہوں کے درمیان مقابلہ اور حریفانہ کشمکش سے ہی عوام کا فائدہ ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

سوشلسٹ پارٹی کی میٹنگ کی خبر سے سنتھالیوں کو کافی تشویش تھی۔ اسپتال کھلنے کی خبر نے ان پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔ انھیں گاؤں کے بھگڑوں اور نہ ہی دوستوں اور دشمنوں کی زیادہ پرواہ تھی۔ لیکن یہ میٹنگ زمین پر ہل چلانے والوں کی میٹنگ تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ ”زمین کس کی ملکیت ہے؟ کسان کی! جو ہل چلائے گا وہ بیج بوئے گا، جو بیج بوئے گا وہی فصل کاٹے گا۔ جو کام کرے گا وہی کھائے گا، چاہے کچھ ہو جائے!“ کالی چرن نے اپنی تقریر میں کہا

کانگریس کے ضلع آفس میں بھی بڑی ہلچل تھی۔ ان کو پارٹی کا صدر منتخب کرنا تھا۔ چار امیدوار میدان میں تھے۔ دو اصلی اور دو نقلی۔ یہ راجپوتوں اور بھومی ہاروں کے درمیان مقابلہ تھا۔ دونوں ذاتوں کے دولت مند تاجر اور زمیندار موٹر کاروں پر پورے ضلع کا دورہ کر رہے تھے اور ایک دوسرے پر خوب کچڑا چھال رہے تھے۔ کٹیہار رسوئل کا مالک سیٹھ بھومی ہار پارٹی کا نمائندہ تھا اور فاربی گینگ جوٹل کا مالک راجپوتوں کا نمائندہ تھا۔۔۔۔۔ جو پیسہ وہ پھینک رہے ہیں آپ کو اُسے دیکھنا چاہیے۔

فانی شورشور ناتھ کے ناول ’میلا آنجل‘ کے ایک اقتباس کا ترجمہ۔ یہ ناول آزادی کے بعد کے ابتدائی سالوں میں مشرقی بھار کے ضلع پورنیا کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

شیاما پرساد کھر جی (1901-1953)



ہندو مہاسبھا کے لیڈر؛ بھارتیہ جن سنگھ کے بانی؛ آزادی کے بعد نہرو کی پہلی کابینہ میں وزیر؛ پاکستان سے تعلقات کے سوال پر اختلاف کی وجہ سے 1950 میں استعفیٰ دیا؛ دستور ساز اسمبلی کے ممبر اور بعد میں پہلی لوک سبھا کے ممبر؛ جموں اور کشمیر کو خود اختیاری دینے کی حکومت کی پالیسی کے مخالف؛ جن سنگھ کے کشمیر پالیسی کے خلاف مظاہروں میں گرفتار کیے گئے؛ جیل ہی میں انتقال ہوا۔

جوں جوں تمام مفادات اور سیاسی طاقت کے امیدواروں سے موافقت اور ہم آہنگی کی صلاحیت کانگریس میں کم ہوتی گئی، دوسری پارٹیاں زیادہ اہمیت حاصل کرتی گئیں۔ ملک کی سیاست میں کانگریس کی بالادستی صرف ایک پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔ ہم اس کتاب کے بقیہ حصوں میں دوسرے پہلوؤں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

1. خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے صحیح جواب کا انتخاب کیجیے:

(a) 1952 کے پہلے عام الیکشن میں لوک سبھا اور کا الیکشن ساتھ ساتھ ہوا تھا۔

(ہندوستان کے صدر جمہوریہ / ریاستی اسمبلیوں / راجیہ سبھا / وزیراعظم)

(b) پہلے عام الیکشن میں جس پارٹی نے دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ سیٹیں حاصل کیں اس کا نام تھا۔

(پرجا سوشلسٹ پارٹی / بھارتیہ جن سنگھ / کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا / بھارتیہ جنتا پارٹی)

(c) سوتنر پارٹی کے رہنما اصولوں میں سے ایک تھا

(مزدور طبقہ کا مفاد / راجاؤں کی ریاست کا تحفظ / حکومت سے آزاد معیشت / یونین

کے ڈھانچہ میں ریاستوں کی خود مختاری)

2. فہرست 'A' کے لیڈروں کو فہرست 'B' کی پارٹیوں سے ملا کر جوڑی بنائیے

فہرست 'A'	فہرست 'B'
(a) ایں۔ اے ڈانگے	i . بھارتیہ جن سنگھ
(b) شینا پارسا دیکھرجی	ii . سوتنر پارٹی
(c) مینومسانی	iii . پرجا سوشلسٹ پارٹی
(d) اشوک مہتہ	iv . کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا

3. ایک پارٹی کی بالادستی کے حوالے سے نیچے چار بیان دیے گئے ہیں۔ ان پر صحیح یا غلط کا نشان لگائیے۔

(a) ایک پارٹی کی بالادستی کی وجہ سیاسی پارٹیوں میں ایک مضبوط متبادل کی عدم موجودگی ہے۔

(b) کمزور رائے عامہ کی وجہ سے ایک پارٹی کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔

(c) ایک پارٹی کی بالادستی کا سلسلہ قوم کے نوآبادیاتی ماضی سے جڑتا ہے۔

(d) ایک پارٹی کی بالادستی ملک میں جمہوری تصورات کی عدم موجودگی کو ظاہر کرتی ہے۔

4. اگر پہلے الیکشن کے بعد بھارتیہ جن سنگھ یا کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے حکومت بنائی ہوتی تو کن پہلوؤں میں

حکومت کی پالیسیاں مختلف ہوتیں؟ دونوں پارٹیوں کے لیے تین تین مثالیں دیجیے۔

5. کانگریس کس طرح سے ایک نظریاتی اتحاد کہی جاسکتی تھی؟ ان نظریاتی لہروں کا بیان کیجیے جو کانگریس میں

موجود تھیں۔

6. کیا ایک پارٹی کی بالادستی کی موجودگی نے ہندوستانی سیاست کی جمہوری نوعیت کو نا موافق طور پر متاثر کیا ہے؟
7. سوشلسٹ پارٹیوں اور کمیونسٹ پارٹی نیز بھارتیہ جن سنگھ اور سوتنر پارٹی کے درمیان تین تین فرق واضح کیجیے۔
8. آپ کے خیال میں ایک پارٹی کی بالادستی کے تحت میکسلو اور ہندوستان میں خاص فرق کیا ہے؟
9. ہندوستان کا ایک سیاسی نقشہ (ریاستوں کی حد بندی کے ساتھ) لیجیے اور ان جگہوں کی نشان دہی کیجیے:

(a) دوا لپی ریاستیں جہاں 1952-67 کے دوران کانگریس اقتدار میں نہیں تھی۔

(b) دوا لپی ریاستیں جہاں اس عرصہ میں کانگریس اقتدار میں رہی۔

10. درج ذیل اقتباس کو پڑھیے اور نیچے دیے گئے سوالوں کے جواب دیجیے:

”پٹیل، کانگریس کی تنظیمی شخصیت، کانگریس کو دوسرے سیاسی جتھوں سے پاک صاف کرنا چاہتے تھے اور کانگریس کو ایک مربوط اور قواعد و ضوابط کی پابند سیاسی پارٹی بنانا چاہتے تھے۔ وہ کانگریس کو سب کو گلے لگانے کے کردار سے دور کر کے ایک مضبوطی سے بٹے ہوئے اصول نظم و ضبط کے پابند کارکنوں کی پارٹی بنانا چاہتے تھے۔ ایک حقیقت پسند ہونے کے ناطے وہ شمولیت سے زیادہ نظم و ضبط پر توجہ دیتے تھے۔ گاندھی جی کا تحریک کے بارے میں جہاں ضرورت سے زیادہ رومانی نظریہ تھا وہاں پٹیل کا یہ تصور تھا کہ کانگریس ایک خالص سیاسی پارٹی ہو جس کا ایک نظریہ ہو اور ضابطوں کی پابند ہو، اس کم فہمی کی دلالت کرتی ہے کہ انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا کہ آنے والے دنوں میں کانگریس کو ایک حکومت کی حیثیت سے کتنا متنوع کردار ادا کرنا ہے۔“۔ رجنی کوٹھاری

(a) مصنف کا یہ خیال کیوں ہے کہ کانگریس کو ایک مربوط اور اصولوں پر عمل کرنے والی پارٹی نہیں ہونا چاہیے۔

(b) شروع کے سالوں میں کانگریس کے متنوع کردار کی کچھ مثالیں دیجیے۔

(c) مصنف یہ کیوں کہتا ہے کہ کانگریس کے مستقبل کے بارے میں گاندھی جی کا تصور رومانی تھا؟

آئیے اسے مل کر کریں

اپنی ریاست میں 1952 سے اور اس کے بعد الیکشن اور حکومتوں کا ایک معلوماتی نقشہ تیار کیجیے۔ اس نقشہ میں مندرجہ ذیل کالم ہونے چاہئیں: انتخابات کا سال، جیت حاصل کرنے والی پارٹی کا نام، حکمران پارٹی یا پارٹیوں کے نام، وزیر اعلیٰ کے نام۔